OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

منٹو کے افسانوں میں سیاسی، سماجی، مزاحمتی رویے: ردِ استعماریت کے تناظر میں

Political and Social Resistance Attitudes in Manto's Fictions in the context of anti-Colonialism

Muhammad Iqbal

Doctoral Candidate Adabiat-e-Urdu, Qurtuba University of Science & Information Technology D.I Khan

Dr. Muzamil Hussain

Assistant Professor, Adabiat-e-Urdu, Qurtuba University of Science & Information Technology D.I Khan

Abstract

Manto highlighted the political, social, economic and psychological problems of his era. Reflected the sentiments of Indians against political oppression and it. Not only did he carry the revolutionary thought of Marxism in his fictions, but he also looked into the eyes of imperialism and did not back down from his position. Lava was boiling in his chest against British imperialism. He had a strong hatred for the capitalist system and class exploitation. His philanthropy is evidenced by the planning in his mind for the eradication of poverty. Minto had no enmity with British imperialism nor was he harassed by the implementation of the new law. Rather, they were against the system behind which the imperialist forces were working, which was poison for the lower classes of the subcontinent. Due to which the economic and economic development of the subcontinent was dependent. By boycotting this imperialist system, Minto proved that the people of the subcontinent wanted real freedom. In which the laborer gets the

CC BY

reward of earning. Slaves are free. They can revolt against oppression and oppression in the face of oppressive and cruel ruler.

Keywords: Progressive thought, Useless traditions, Marxist thought and ideology, Sentiments of Indians against Political oppression, Capitalist system and class exploitation, Eradication of Poverty, Freedom, Oppressive and cruel ruler

تمہید

"اصطلاح میں لفظ "استعمار" کا اطلاق ایک ایسے عمل پر ہوتا ہے جس کے ذریعے ایک طاقتور قوم کسی کمزور قوم پر غلبہ پا کر اس کے وسائل پر تصرف کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ انگریزی میں اس کو (Imperialism)، ہندی میں سامراج، اردو میں شہنشاہیت اور نو آبادیات جیسی اصطلاحات مستعمل ہوتی ہیں کئی ناقدین، محققین، مؤرخین نے استعمار کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ تاہم اکثریت ایک نکتے پر متفق ہے۔ "استعمار" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ع۔م۔ر" عَمَرَ، عَمرًا سے مراد ہے آباد ہونا۔ اسی سے باب "استفعال" کے وزن پر "استعمار" ہے جس کے لغوی معنی ہیں: کسی جگہ پر آباد ہونے کی خواہش کرنا یا کوشش کرنا"[1] لفظ "امپیریل ازم" "ایمپائر" سے ماخوذ ہے جس سے مراد فوجی فتوحات کے ذریعے اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرنا۔ جبکہ استعماریت ایک پالیسی ہے جس کے ذریعے کسی غیر ترقی یافتہ علاقے یا کمزور ملک کے معاشی اور سیاسی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے۔ امپیریل ازم ایک وسیع اصطلاح ہے جبکہ استعماریت امپیریل ازم کی ایک قسم ہے۔ استعمار کا براہ راست تعلق اگرچہ عسکری، سیاسی، اقتصادی، لسانی، مذہبی اور ثقافتی بالادستی سے ہے۔ انہی اغراض و مقاصد کے تحت ایک مکمل استعماری نظام تشکیل دیا جاتا ہے۔ ان سب میں بنیادی حیثیت اقتصاد کو حاصل ہے۔ کیونکہ اقتصادی بالادستی ہی تمام تر بالادستیوں کی کلید ہے۔ اقتصاد کے ساتھ باقی عناصر مل کر ایک مکمل سامراجی پالیسی کی شکل اختیار کرتی ہے۔

"ردِ استعماریت" کے لیے استعمار شکن، ترک نو آبادیات، استعمار شکست، رد نو آبادیات اور سامراج شکن نام استعمال کیے جاتے ہیں۔ رد نو آبادیات سے مراد "یورپی مرکزیت" سے انکار، مغرب سے سیاسی، سماجی، معاشی، سائنسی، فکری آزادی اور مقامی تہذیب و ثقافت کی بازیافت ہی نہیں بلکہ مغرب کے مقابلے میں "مشرق" کو لا کھڑا کرنے کی بھی کوشش ہے۔ نو آبادیاتی نظام اور نو سامراجیت کے جملہ استعماری بیانیوں سے انحراف اور روگردانی "ردِ استعماریت" ہے۔ مزاحمت کرنا اور معاونت نہ کرنا ردِ استعماریت کی ابتدائی حالت ہے۔

ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام سے قطع نظر بالائی سماجی طبقے نچلے طبقوں کا استحصال کر رہے تھے۔ سماجی سطح پر بیداری کی کوئی تحریک عمل میں نہ آئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں اشتراکی خیال عام ہونے لگے۔ اس کے فروغ نے جمہوریت کے علاوہ معاشی مساوات کا تصور بھی ہندوستان کے نوجوان ذہنوں کو دیا۔ جنگ کے بعد ملک میں سیاسی بحران کے علاوہ معاشی بحران بھی شدت اختیار کر گیا۔ افراط زر کی وبا عالمگیر صورت اختیار کر گئی۔ برطانوی استعمار نے ہندوستان پر سیاسی، معاشی، علمی غلبہ کے ساتھ ساتھ تہذیبی، ثقافتی یلغار کی۔ جس کے باعث نو آبادیاتی تمدن پر مسلط ہوا۔ نو آبادیاتی جاگیر دار اور سرمایہ دار پیدا ہوئے انہوں نے کسان، مزدور اور نچلے طبقے کے عوام کے لیے استحصال کا روپ دھار لیا۔ ہندوستان میں انگریزی استعمار ظاہری طور پر یوں دکھائی دیتا ہے کہ اس نے یہاں پر ریلوے، قانون، تعلیم اور سیاست کے نظام ہائے فکر عطا کیے یا جگہ جگہ آمد و رفت

کی سہولتیں یا روزگار کے لیے ادارے قائم کیے لیکن اس کا بنیادی مقصد دولت پر قبضہ کرنا تھا۔ دولت پر قبضہ کرنا اتنا بڑا ظلم نہ ہوتا اس نے ہندوستان کے تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور لسانی تشخص کو بھرپور نقصان پہنچایا۔

بیدی نے انسانی المیوں، دکھوں اور پریشانیوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ معاشی ناہمواری اور دکھ بانٹنے کا یہ جذبہ بیدی کے افسانوں میں اس قدر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ ایک حقیقت نگار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشی، معاشرتی، جنسی و نفسیاتی پہلوؤں پیوست نظر آتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں۔ کرشن چندر کسی بات کو چھوٹی سطح سے عالمی سطح پر منطبق کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کا یہ بلیغ انداز ان کے افسانے "کچرا بابا" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کا یہ اعتقاد ہے کہ "دنیا سے نیکی ختم ہو سکتی ہے، رفاقت ختم ہو سکتی ہے لیکن غلاظت اور گندگی ختم نہیں ہو سکتی۔" احمد ندیم قاسمی دیہی معاشرت کے مصور ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے ظالم جاگیرداروں، زمینداروں، سرکاری افسروں اور بدیسی آقاؤں کی مکروہ غلیظ سوچ کے عکاس ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ہندوستان کے مفاد پرست سامراجی حکمرانوں کا تعصب، تنگ نظری اور سیاسی جبر دکھاتے ہیں۔ سیاسی و فوجی آمریت کے پر زور غلبہ کے خلاف مظلوم طبقہ پر آمرانہ سیاسی پالیسیوں کی دکھ بھری داستان کا عکس پیش کرتے ہیں۔

موپساں اور منٹو میں مماثلت

موضوع کے انتخاب اور طریق کار کی نوعیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو موپساں اور منٹو میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ موپساں نے فرانس کے اخلاقی طور پر زوال زدہ معاشرے کا نقشہ کھینچا ہے۔ حالات کی ستائی ہوئی عورتوں کی بپتا بیان کی ہے جس میں جنس کا متشدد زاویہ بھی کافی نمایاں ہے اس رخ سے منٹو نے ہندوستانی سماج میں طوائف اور جنسی گھٹن کی پیدا کردہ فضا کو پیش کیا ہے۔ منٹو کا افسانہ "تماشا" ہو یا "نیا قانون"، "نعرہ" ہو یا "ٹوبہ ٹیک سنگھ" یا "یزید" ان تمام میں طاقتور قوتوں کے خلاف ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ کھول دو، شاداں اور موم بتی کے آنسو کے عقب میں کارپوریٹ کلچر اور انگریز سامراج کی وہ کارستانیاں دکھائی دیتی ہیں جن کی بدولت عورت کا استحصال ہو رہا ہے۔ منٹو اس جبر و استحصال اور سفاکیت کے خلاف اپنے کرداروں کے ذریعے نو آبادیاتی، استعماری، سامراجی رویوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

"منٹو کتنا بڑا باغی اور انقلابی تھا، اس کے سینے میں برطانوی سامراج کے خلاف کیسا لاوا ابل رہا تھا، سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی استحصال سے اسے کتنی نفرت تھی، غربت و افلاس کے خاتمے کے لیے اس کے ذہن میں کیسے کیسے منصوبے تھے، معاشی آزادی کا کیسا عاشق اور انسانیت کا وہ کتنا بڑا دوست تھا، اس کا اندازہ فی الواقع منٹو کے ابتدائی افسانوں ہی سے ہوتا ہے۔"[2]

منٹو کے افسانے اور عام انسان

منٹو کے افسانوں کا موضوع عام انسان ہے وہ کسی انسان کو کسی نظریے یا تعصب کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ اپنے کردار کے باطن میں اتر کر اس کے اصلی چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔ منٹو کے زیادہ تر کردار چھوٹے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے عام لوگ طوائفیں، دلال، غنڈے اور قاتل ہیں۔ جو معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی اور مصدقہ قدروں کے تقدس کو پامال کرتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں کا سیاسی، سماجی مزاحمتی رویوں کا ردِ استعماریت کے تناظر میں جائزہ لیا جاتا ہے۔ منٹو دراصل برصغیر میں سامراجیت اور سامراجی نظام کے زبردست مخالف تھے۔ جس کا کھلم کھلا اظہار انہوں نے اپنے افسانوں میں بے دھڑک ہو کر کیا ہے۔ انگریزوں نے برصغیر میں اجارہ داری قائم کرنے کے لیے جو پالیسیاں بنائیں وہ برصغیر کے نچلے متوسط طبقے کے خلاف تھیں۔ منٹو کی نفرت اور حقارت کا سب سے بڑا سبب سامراج کا جابرانہ رویہ تھا۔ سامراج نے اپنی ثقافت، مذہب، علم، زبان اور بالخصوص اقتصاد کے لیے جس ظلم پر مبنی نظام کی بنیاد رکھی وہ غریبوں، محنت کشوں کے معاشی قتل کا منہ

بولتا ثبوت ہے۔ منٹو کو انگریز سامراج سے دشمنی نہ تھی نہ ہی وہ نئے قانون کے نفاذ سے ہراساں تھے۔ بلکہ وہ اس نظام کے خلاف تھے جس کے پیچھے سامراجی قوتیں کارفرما تھیں جو برصغیر کے ان نچلے طبقوں کے لیے زہر ہلاہل تھا۔ جن کی وجہ سے برصغیر کی معاشی و اقتصادی ترقی کا دارومدار تھا۔ منٹو نے اس سامراجی نظام کا بائیکاٹ کر کے یہ ثابت کیا کہ برصغیر کے عوام حقیقی آزادی چاہتے ہیں۔ جس میں مزدور، محنت کش کو کمائی کا صلہ ملے۔ غلام آزاد ہوں۔ وہ جابر ظالم حاکم کے روبرو ظلم وستم کے خلاف بغاوت کر سکیں۔ عدل، اخوت، مساوات کا بول بالا ہو۔ غرض ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں پوری انسانیت کی فلاح ہو۔ یہ منٹو کا مشن ہے جس کی تبلیغ وہ اپنے افسانوں میں مبلغ کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار عام زندگی سے تعلق رکھنے والے عام انسان ہیں۔ جن کا انتخاب منٹو نے اپنے نقطہ نگاہ کی ترجمانی سے نہیں دیکھتا، جن کا پیشہ ذلیل وغلیظ ہے مگر ان کے بدبودار جسم میں روح کی پاکیزگی کا احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی دلال دمِ آخریں امانتوں کا سچا امین بنتا ہے۔ جب کوئی طوائف ذلیل پیشہ چھوڑ کر باعزت زندگی نہیں گزار سکتی۔ منٹو ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ان انسانوں کو کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے جو ریاکاریوں اور مکاریوں سے غریب سادہ لوح انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

قلیوں کی زندگی

"خونی تھوک" میں منٹو نے نچلے طبقے کے قلیوں کی زندگی کی خستہ حالی اور مجبوریوں کو ظاہر کیا ہے۔ خونی تھوک کا قلی معمولی سی بات پر سینے پر انگریز صاحب کے نوکیلے بوٹ کی ٹھوکر کھالیتا ہے۔ مگر گالی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس کا شعلہ انتقام صاحب کے منہ پر تھوک کر ہی سرد پڑتا ہے۔ مرنے سے پہلے وہ اپنی زخمی چھاتی پر زور دے کر چند الفاظ ادا کرتا ہے: "میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں۔۔۔ دس روپے۔۔۔ ایک انسانی جان کی قیمت۔۔۔ میرے پاس بھی ہے۔۔۔ جو ۔۔۔ یہ لو۔۔۔"[3]"

منٹو کے اس افسانے میں قلیوں کا نمائندہ گو کہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے مگر اسے جان سے زیادہ فکر اور احساس عزت نفس کا ہے۔ اسے گوارہ نہیں کہ کوئی صاحب اپنے رعب اور دبدبے سے اسے اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنائے۔ سامراجی صاحب کے اس ظالمانہ رویے کے خلاف یہ مزاحمت دراصل منٹو کی مزاحمت ہے۔ منٹو کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا جب نام نہاد عدالت میں صاحب کو سزا سے بچانے کے لیے جان کی معمولی قیمت کے عوض بری الذمہ قرار دیا ہوگا۔

برصغیر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان تقریباً دو سو سال برطانوی تسلط کے زیر اثر رہا۔ سیاسی و ثقافتی سطح پر برطانیہ کا غلبہ رہا۔ اس تسلط اور غلبہ کے حصول کے لیے برطانیہ نے ظلم و تشدد، تہذیبی و ثقافتی حکمت عملیوں کو خوب آزمایا جس کے نتیجے میں ہندوستان برطانیہ کی نوآبادی بن گیا۔ اس پر تشدد استحصالی نظام کے خلاف ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں نے برطانیہ سے اس تسلط کے خلاف ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔

"نیا قانون" اور استعماریت

"نیا قانون" اردو کے شاہکار افسانوں میں سے ہے۔ یہ افسانہ 1938ء کے "ہمایوں" میں شائع ہوا اور اس میں برطانیہ کی آئینی مراعات پر زہرخند کی برق پاشی کی گئی ہے جو 1935ء کے ایکٹ کے تحت نوآبادی رعایا کو دی گئی تھیں۔ اس افسانے میں منٹو کے سیاسی، سماجی شعور میں نفسیاتی شعور اور فنی ریاضت و معروضیت گھل مل گئے ہیں۔"[4]

"نیا قانون" کا پس منظر سیاسی نوعیت کا ہے جس کا اہم کردار منگو کوچوان جو اپنے حلقے میں علمی برتری رکھتا ہے۔ وہ نئے قانون یکم اپریل کے نفاذ سے امیدیں وابستہ کر بیٹھتا ہے۔ وہ ہر تبدیلی کو اس آئین نو کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کرتا ہے مگر اس کی قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ نہ تو نئے قانون کا نفاذ ہوتا ہے نہ غلام ملک (ہندوستان) کے غلاموں کو سامراج سے

نجات ملتی ہے۔ استاد منگو کو انگریزوں سے شدید نفرت تھی اس لیے کہ ہندوستان پر ان کی حکومت تھی۔ وہ ہندوستانیوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے مگر نفرت کی سب سے بڑی وجہ چھاؤنی کے گورے تھے جو اس کے ساتھ ذلیل کتے جیسا سلوک کرتے تھے وہ جب بھی ان کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی آجاتی۔ وہ کہا کرتا تھا: "ان کے لال جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔"[5]

استاد منگو کی یہ نفرت انسانوں سے نہیں بلکہ اس نظام سے ہے جو سیکڑوں سالوں سے برصغیر کی غریب عوام پر مسلط تھا۔ جس کا مقصد محض ان خستہ حال لوگوں کو محکوم بنانا تھا جو آزادی اور خوشحالی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں سے نفرت ، سماجی تبدیلی کی خواہش اور لوگوں کے سیاسی ، سماجی رویوں پر کڑھنا اسے ان لوگوں کا نمائندہ بنا دیتا ہے جو ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات بلکہ سماج میں تبدیلی کی خواہش سے بھی روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

"نعرہ" اور شرف آدمیت

"نعرہ" منٹو کو شرف آدمیت کا بھرپور احساس تھا۔ دکھی انسانوں سے بے حد محبت تھی۔ ان آقاؤں سے شدید نفرت تھی جو کمزور انسانوں کو غلام سمجھتے تھے۔ اس کا بھرپور اظہار منٹو نے اپنے اس افسانے میں کیا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد منٹو کے اس افسانے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نعرہ" منٹو کا سب سے بلند آہنگ افسانہ ہونے کے باوصف مجروح انا کی سائیکی کی موثر تصویر کشی کرتا ہے اس افسانے میں منٹو کا لب ولہجہ ڈرامائی ہی نہیں رمزی بھی ہے۔"[6]

قناعت پسند، خوددار (کھاری سینگ والا) کیشولال سیٹھ کو دو ماہ کھولی کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بیوی کی اچانک بیماری کرائے کی عدم ادائیگی کا باعث بنتی ہے۔ وہ سیٹھ سے ہمدردی کی بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے۔ وہ سیٹھ جی سے کرائے کی ادائیگی میں مہلت کا طلب گار ہے مگر جواباً اسے دو گالیاں ملتی ہیں جو کیشولال جیسے انا پرست، خوددار کی شایان شان نہیں۔ سیٹھ کی یہ دو گالیاں اسے بھاری محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے اس کا شعلہ انتقام بے بسی پر غالب آجاتا ہے۔ وہ اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو کر اوپر دیکھتا ہے اور سیٹھ کو گالی دیتا ہے:

"سنگین عمارت کی طرف جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور۔۔۔۔ اس کے حلق سے ایک نعرہ۔۔۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا۔ ہٹ تیری۔۔۔!"[7]

"اس کا پتی" منٹو نے اس افسانے میں بالائی طبقے کے نوجوان ستیش کے غلیظ ذہن میں چھپی غلاظت کو دکھایا ہے۔ نچلے طبقے کی مجبور و بے بس روپا گھر بسانے کی آرزو میں عزت گنوا بیٹھتی ہے۔ دوسری طرف نتھو روپا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ستیش اسے ڈرا دھمکا کر پیچھا چھڑائے۔ اگرچہ ستیش روپا کا بچہ ضائع کرانے کے عوض پیسوں کا لالچ دیتا ہے۔ مگر نتھو کو یہ سودا قبول نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ستیش روپا کا ہاتھ تھام لے اور اسے اپنی پتنی بنا لے۔ نتھو کے یہ الفاظ ستیش کو زہر لگتے ہیں وہ غصے میں بھڑک اٹھتا ہے اور کہتا ہے:

"۔۔۔ میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں۔۔۔ پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔ میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا۔۔۔ تو روپا کے بچے کا باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے اگر میں نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے دل کو دھکا لگے گا۔۔۔ تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں رکھتا۔"[8]

یہ مسئلہ روپا کا نہیں جو گھر بسانے کی آرزو میں اپنی عزت کی دھجیاں بکھیر دیتی ہے بلکہ روپا جیسی کئی لڑکیوں کا مسئلہ ہے جو ستیش جیسے درندہ صفت انسان کی ہوس کا شکار ہوتی ہیں۔ جو اپنی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر روپا اور نھو کو گالیاں دے کر بھگا دیتا ہے۔

"لائسنس" اور معاشرتی تبدیلیاں

"لائسنس" منٹو نو آبادیاتی دور میں رونما ہونے والی ان تمام معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا جنہوں نے مقامی لوگوں کو ان کے کلچر، تہذیب اور ثقافت سے دور کر دیا تھا۔ گو کہ نو آبادیاتی تبدیلیوں کے اثرات سے طرز زندگی میں جدت پیدا ہوئی۔ سوچ کے زاویے بدلے مگر سیاسی و سماجی سطح پر ان تبدیلیوں کے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ جن سے برصغیر کے نچلے طبقے کے لوگ اثر انداز ہوئے۔ انہیں وہ آزادی نہ ملی جس کا خواب صدیوں سے دیکھ رہے تھے۔ "لائسنس" میں میونسپل کمیٹی کا افسر نیستی کا ٹانگہ چلانے کا لائسنس ضبط کرنے کا حکم نامہ جاری کرتا ہے۔ اس بے جا پابندی کے خلاف نیستی احتجاج کرتی ہے، ٹانگہ چلانے کا جواز پیش کرتی ہے مگر بے حس افسر پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نیستی پر پابندی عائد کر کے روزگار چھین لیا جاتا ہے۔ نیستی کی مزاحمت کے جواب میں افسر چکلے میں بیٹھنے کی ترغیب دیتا ہے:

میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟۔۔۔ حضور آپ رحم کریں۔۔۔ محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟۔۔۔ میں کیا کروں، بتایئے نا مجھے۔۔۔ افسر نے جواب دیا۔ جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو۔۔۔ وہاں زیادہ کمائی ہے۔"[9]

"کھول دو" اور معاشرتی منافقت

"کھول دو" منٹو کے تقسیم کے بعد کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں فنی اور نظریاتی دونوں حیثیتوں میں ایک اہم تغیر اور ارتقا پایا جاتا ہے۔ 1947ء کے المناک واقعہ نے برصغیر کے وہ لوگ جنہیں شریف النفس، ہمدرد اور دردمند سمجھا جاتا تھا، کے چہروں سے نقاب نوچ کر اتار پھینکے۔ ان کے نیچے چھپی ہوئی نفرت، انتقام اور سفاکیت ظاہر ہوئی۔ منٹو کا افسانہ "کھول دو" اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو زخمیوں، بھٹکے ہوؤں اور مارے جانے والوں کی کہانی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس افسانے کے متعلق رقمطراز ہیں: "عام طور پر افسانہ نگاروں نے اس موقع پر یا ستر پوشی کی ہے یا پھر زخموں کی نمائش، یہاں منٹو کے فن میں ان مجسمہ سازوں اور مصوروں کا ہنر یا جو ہر جذب ہو گیا ہے جو مقدس عورتوں کے برہنہ مجسمے یا تصویریں بناتے ہیں مگر ان کی تخلیقات کی معصومیت سفلی جذبات کو برانگیختہ نہیں ہونے دیتی۔"[10]

سکینہ کے ذہن میں ایسا زہر سرایت کر جاتا ہے کہ اس کے ذہن میں "کھول دو" کے الفاظ سے جو غیر شعوری حرکت سرزد ہوتی ہے اس سے انتہائی دہشت زدگی کا اظہار ہوتا ہے ان فسادات میں خوف اور دہشت کا سبب خون ریزی، قتل و غارت نہ تھا بلکہ جبری جنسی استحصال تھا۔ جب ڈاکٹر نے ہسپتال میں اسٹریچر پر پڑی جاں بہ لب سکینہ کی نبض ٹٹولی اور کہا: "کھڑکی کھول دو۔۔۔ سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا۔ زندہ ہے۔۔۔ میری بیٹی زندہ ہے۔۔۔ ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔"[11]

اس رد عمل پر ڈاکٹر سر سے پاؤں تک پسینے میں غرق ہو گیا، سکینہ کے چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھ کر باپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ منٹو کا یہ افسانہ جس تجزیئے کا متقاضی ہے اب تک یہ اس سے محروم ہے۔ مہاجر کیمپوں میں پناہ گزین ہمدردی کی بھیک کے لیے ترستے رہے۔ سرکاری کارندے کاغذوں کے فرضی پلندے بنا بنا کر جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بنیادی سہولتیں میسر نہ ہوئیں مگر وہ خوش تھے اس لیے کہ وہ اب ایک آزاد سرزمین پر سانس لے رہے تھے۔

قیام پاکستان کی حمایت

"یزید" قیام پاکستان کے سلسلے میں دیگر ادیبوں کے برعکس منٹو کا نقطہ نظر منفرد تھا۔ وہ نہ صرف نظریہ پاکستان کے حامی تھے بلکہ اس حقیقت کا صدق دل سے اعتراف بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کی سیاسی و معاشرتی صورت حال کو ہدف تنقید بنا کر عالمی سیاست کو نئے زاویہ نظر سے بھی روشناس کرایا۔ منٹو نے سیکولر جمہوری بھارت کا روپ دکھایا ہے جب پاکستان کے لوگوں کو بھوکا مارنے کی خاطر دریاؤں کا رخ موڑنے اور پانی پر پابندی کی "یزیدی سازش" کی جاتی ہے اور دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں اس تناظر میں ان کا پسندیدہ افسانہ "یزید" ہے جو قیام پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا۔ سید وقار عظیم "یزید" کے افسانوں کے متعلق رائے کا اظہار کرتے ہیں: "یزید کے اکثر افسانے جو اعصابی جنگ کی کسی عارضی فتح کے دنوں میں لکھے گئے ہیں، نہ صرف ان ساری خرابیوں سے پاک ہیں جو منٹو کے دور جدید کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہیں بلکہ فن کے اتنے اچھے نمونے ہیں کہ ان پر اچھے سے اچھا افسانہ نگار بھی رشک کر سکتا ہے۔"[12]

منٹو کے کرداروں کی کشمکش اور جدوجہد سماج سے تھی۔ یہ بعض کرداروں میں شعوری اور بعض میں غیر شعوری بے چینی اور اضطراب کے طور پر دکھائی دیتی ہے۔ کریم داد اس کشمکش میں شعوری طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جو سماج کے خلاف ہے۔ وہ کسی بے چینی یا اضطراب کا شکار ہو کر چودھری نتھو کو نہیں للکارتا بلکہ اس کے دل میں جذبہ ہے جو چودھری نتھو کی گالی کے رد عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ 1947ء کے دردناک فسادات کے پس منظر میں یہ افسانہ ایک المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خون ریزی، آتش زنی، لڑکیوں کا اغوا اور عزتوں کی پامالی وہ چرکا تھا جس نے جسم سے زیادہ روح کو گھائل کیا۔ تقسیم کے بعد سب سے بڑا مسئلہ دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا مسئلہ تھا۔ یہ وہ مسئلہ تھا جس کے پیچھے گھناؤنی سازش تھی۔ زمینوں کو بنجر بنا کر بھوک و افلاس جیسے مسائل سے دوچار کرنا نوزائیدہ مملکت کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا۔ چودھری نتھو ہندوستان والوں کو گالیاں دے کر بھڑاس نکالتا ہے مگر کریم داد کی مزاحمت پر چودھری اور بھی بھڑک اٹھتا ہے اور کہتا ہے:

"گالی نہ دے چودھری کسی کو۔۔۔ کیا کہا؟ میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔۔۔ حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا کسی کو! کیا لگتے ہیں وہ تمہارے؟"[13]

کریم داد دوسرے لوگوں کے برعکس فسادات کی آگ سے گزر کر بھی جانی و مالی نقصان سے بے نیاز ہے۔ اس لیے وہ دشمن کو گالی نہ دینے کا جواز پیش کرتا ہے۔ دریاؤں کا پانی موڑنے یا بند کرنے کا رد عمل بھی ظاہر کرتا ہے۔ جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اس کا نام یزید یہ سوچ کر رکھتا ہے کہ یزید نے پانی بند کیا تھا یہ کھولے گا۔ یہی وہ استعمار تھا جس سے سامراجی قوتوں نے غلبہ اور مفادات حاصل کرنے کے لیے کئی ہتھکنڈے استعمال کیے۔ برصغیر کے مفاد پرست حکمرانوں کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھا کر نچلے طبقے کا استحصال کیا۔ "1919ء کی ایک بات" میں منٹو نے واضح طور پر جلیانوالہ باغ میں رونما ہونے والے دردناک خونی حادثے کی تفاصیل، اس کے پیچھے سامراجی ہتھکنڈے اور دہشت ناک تاثرات ہیں اگرچہ منٹو نے یہ افسانہ قیام پاکستان کے بعد لکھا لیکن تقسیم سے پہلے اس حادثے کی واضح تصویر ملتی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں: "۔۔۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام منٹو کے تخیل پر محیط رہا، اس نے فنی تکمیل "1919ء کی ایک بات" کے روپ میں پائی۔ اس افسانے میں جہاں پورے حادثے کی تفاصیل، سیاسی عواقب اور دہشت ناک تاثرات کی عکاسی موجود ہے بلکہ روشنی اور اندھیرے کا وہ کھیل بھی موجود ہے جس میں بیان کرنے والا اپنی دانست میں ناپسندیدہ پہلوؤں کو کم کر دیتا ہے یا انہیں حسب منشاء تبدیل کر لیتا ہے۔"[14]

تاریخ کا یہ بڑا حادثہ اس وقت پیش آیا جب جنرل ڈائر کی سرپرستی میں پچیس ہزار کے مجمع پر گورکھوں اور سکھوں کی مدد سے نہتے انسانوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ایک ہزار لوگ جاں بحق اور تقریباً تین چار ہزار زخمی ہوئے۔ رولٹ ایکٹ کے

خلاف پنجاب میں تحریک چلی۔ سرمائیکل نے اس تحریک کے خلاف شدید رد عمل ظاہر کیا۔ ہڑتالوں، جلسوں میں حصہ لینے والے سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔

یہ وہ حالات، واقعات تھے جن کو منٹو نے اس افسانے میں بیان کرکے تاریخ کا دردناک باب رقم کیا۔ جس کے عقب میں سیاسی گھناؤنی سازشیں تھیں۔ انگریز سامراج کے ظلم و استبداد سے نجات اور حق آزادی کے لیے ہر اس آواز کو دبایا گیا جس سے انگریز سامراج کو خطرہ لاحق تھا۔ اس سانحے میں بے گناہ انسان لقمہ اجل بنے جن کے خون سے انگریز سامراج نے خوب ہاتھ رنگے۔ اس سیاسی و انتظامی کنٹرول کے نتیجے میں انگریز سامراج نے برصغیر کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ یہاں کی مصنوعات اور ایجادات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنی مصنوعات اور ٹیکنالوجی کے عوض کثیر زرمبادلہ کمایا۔ یہ وہ استعمار تھا جس کے تحت برصغیر کی غریب عوام کے حقوق پامال ہوئے۔ معاشی عدم استحکام کی بدترین صورت پیدا کرکے لوگوں کا استحصال کیا گیا۔ منٹو ان حالات سے قطعی طور پر بے خبر نہیں تھا۔ اسے نچلے طبقے کی بدحالی کا بھرپور احساس تھا۔ اسے انگریزوں کی غلامی سے شدید نفرت تھی۔ اس نفرت کا اظہار اپنے افسانوں میں بھی کیا ہے۔

"ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور تقسیم برصغیر کا پس منظر

"ٹوبہ ٹیک سنگھ" تقسیم برصغیر کے پس منظر میں لکھی جانے والی یہ کہانی ایک پاگل "بشن سنگھ" کی ہے جو اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہے۔ عقل مندوں کے فیصلے پر پاگلوں کا تبادلہ اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا جتنا کہ مٹی سے بچھڑنے کا دکھ۔ بشن سنگھ کی محبت کی جڑیں ٹوبہ ٹیک سنگھ گاؤں میں جہاں اس کی زمینیں تھیں، اس قدر پیوست تھیں کہ وہ تقسیم اور ہجرت کا کرب بھول گیا مگر اس مٹی سے جدائی کے زخم کبھی نہ بھول سکا۔ اس کے اعصاب پر اسقدر گہرا اثر ہوا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتا رہا۔ پھر ایک دن وہ آیا جب پاگلوں کا تبادلہ ہوا۔ بشن سنگھ کی باری آئی تو اس نے واہگہ پر افسر سے پھر وہی سوال کیا۔ مگر جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ وہ بھاگ کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا یہ کہتے ہوئے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔ اسے بہت سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانا اور جب اسے زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی وہ درمیان میں ایک جگہ اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے ضرر تھا اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ تبادلے کا سلسلہ جاری رہا۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے بشن سنگھ کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی: "اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان، درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔"[15] منٹو کی یہ کہانی ہجرت اور بٹوارے کی یادگار ہے جس کا دکھ ایسا دکھ تھا جس سے اعصاب شل ہو گئے۔ مٹی سے محبت اور بچھڑنے کا دکھ لاکھوں مہاجرین کا مقدر بنا۔ منٹو نے اس افسانے میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے جذبات و احساسات سے یہ ظاہر کیا ہے کہ دو قوموں کے مابین حدود کا تعین کرنا آسان تھا مگر ان کے دل جدا جدا نہ کرنا مشکل تھا۔

نیستی چارو ناچار جسم فروشی کے لائسنس کے لیے عرضی دیتی ہے اسے فوراً پاکستان کے چکلے کا لائسنس جاری کر دیا جاتا ہے۔ یہاں منٹو کی تلخی اور بڑھ جاتی ہے۔ منٹو جس جبر و ظلم، استحصال، تنگ نظری اور ریاکاری سے لڑتا رہا اسے ختم نہ کر سکا۔ یہاں منٹو نے ریاستی اداروں کی ان خرابیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو ملکی سالمیت اور ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جس سماج میں جائز طریقے سے روزی کمانے پر پابندی ہو اور ذلیل پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے وہ سماج عورتوں کے حقوق کا تحفظ کیسے کرے گا۔ یہی وہ جبر، ناانصافی ہے جس کا شکار نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ جس کا اظہار منٹو نے اس افسانے میں کیا ہے۔ "یزید" قیام پاکستان کے سلسلے میں دیگر ادیبوں کے برعکس منٹو کا نقطہ نظر منفرد تھا۔ وہ نہ صرف نظریہ پاکستان کے حامی

تھے بلکہ اس حقیقت کا صدق دل سے اعتراف بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کی سیاسی و معاشرتی صورت حال کو ہدف تنقید بنا کر عالمی سیاست کو نئے زاویہ نظر سے بھی روشناس کرایا۔ منٹو نے سیکولر جمہوری بھارت کا روپ دکھایا ہے جب پاکستان کے لوگوں کو بھوکا مارنے کی خاطر دریاؤں کا رخ موڑنے اور پانی پر پابندی کی "یزیدی سازش" کی جاتی ہے اور دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں اس تناظر میں ان کا پسندیدہ افسانہ "یزید" ہے جو قیام پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا۔ سید وقار عظیم "یزید" کے افسانوں کے متعلق رائے کا اظہار کرتے ہیں: "جی آیا صاحب" ننھے بچے قاسم کی درد انگیز کہانی میں ظالم آقا کی بے رحمی و خود غرضی کو دکھایا گیا ہے۔ جس کی بے جا سختی اور کام کی شدت سے اکتا کر "ننھا قاسم" تیز دھار چاقو سے اپنی انگلیوں کو زخمی کر کے کام سے بچنے کی سبیل تلاش کر لیتا ہے۔ مگر یہ سبیل کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ وہ معذور ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا آخر خیراتی ہسپتال میں دم توڑ دیتا ہے۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ، وقت بے وقت کام کی شدت سے قاسم کا دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ اسے نیند میں بھی راحت میسر نہیں ہوتی۔ صاحب کا تلخ رویہ یہ سب عذاب جان بن جاتے ہیں۔

"یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے بوٹ صاف کر لیے ہونگے۔۔۔ نمک حرام!۔۔۔"[16]

یہ منٹو کا واحد افسانہ ہے جس میں منٹو نے ایک ننھے بچے کو ان بچوں کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے جن کے آقا انھیں عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں۔ حقوق انسانی کا یہ علم بردار مظلوم و بے بس انسانوں کو پاؤں تلے روند کر انسانیت، اخوت و محبت کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ جب تک یہ صاحب ان مظلوم بچوں (جن کے والدین غربت و افلاس کے خوف سے انھیں مار دیتے ہیں) کو اپنے بچوں کی طرح نہیں سمجھتے۔ ننھے قاسم کی طرح یہ صاحب بچوں پر ظلم و ستم ڈھاتے رہیں گے "شاداں" منٹو دکھاوؤں کا قائل ہرگز نہیں تھا۔ وہ اصل حقیقت کو ظاہر کرنے سے نہیں گھبراتا تھا۔ چیزوں کو جس طرح دیکھتا اسی طرح بیان کرتا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ آرٹ اصلیت تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ منٹو نے جنسی پرورژن اور جرائم کے بیان کے ذریعے یہ انکشاف کیا تھا کہ یہ متمدن سماج اتنا متمدن نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ بدکاری کو نہیں چھپاتا بلکہ اس کے گھناؤنے چہرے سے نقاب نوچ پھینکتا ہے۔ اس کا اظہار منٹو کے افسانے "شاداں" میں ملتا ہے۔ جس کے انجام میں کراہت سے زیادہ ستم ظریفی اور طبقاتی جبر کا احساس ہوتا ہے۔ وارث علوی اس افسانے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"پورا افسانہ بچوں کے کھیل کود سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خان بہادر کا شاداں کے ساتھ جو ایک جوانی میں قدم رکھتی ہوئی ملازمہ ہے، تاریک کھیل بھی چلتا رہتا ہے۔"[17]

خان بہادر کی فطرت میں جو بیماری اور پرورژن ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتی کیوں کہ وہ جس متمدن سماج میں رہتا ہے اس میں یہ پرورژن کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن منٹو اس ریاکاری اور بدکاری کے پردے میں خان بہادر کے گھناؤنے چہرے کو دیکھ سکتا ہے۔ جہاں شاداں کے قتل کے سنگین جرم میں خان بہادر کو بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہسپتال میں مرنے سے پہلے منہ سے نکلے ہوئے دو لفظ انصاف کی فراہمی کو غیر یقینی بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کی جھوٹی گواہی نام نہاد عدالت میں کام کر جاتی ہے:

"خان بہادر اس قابل ہی نہیں کہ وہ کسی عورت سے ایسا رشتہ قائم کر سکے۔ شاداں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نابالغ تھی۔ اس کی بیوی نے اس کی تصدیق کی۔"[18]

یہاں منٹو کڑھتا ہے جہاں گھناؤنے جرم کے ارتکاب کے باوجود انصاف خاموش نظر آتا ہے۔ نہ تو خان بہادر کے جنسی جذبات کا مظہر آلہ قتل "مسواک" کسی کو نظر آتا ہے نہ شاداں کے لہو میں لتھڑے ہوئے کپڑے۔ یہی وہ خود فریبی ہے جس کو ہم مہذب سمجھتے ہیں اور جو ہمیں متمدن شخص کی سرزد بھیانک حرکتوں سے دور لے جاتی ہے اور خان بہادر جیسے کئی مہذب معصوم لڑکیوں کی عزتوں کی دھجیاں بکھیر کر بے گناہی کی سبیل تلاش کر لیتے ہیں۔

نتائج بحث

تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے استعماریت کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ انگریزوں نے مقامی باشندوں کی فطری و سماجی کمزوریوں سے کماحقہ فائدہ اٹھایا اور علمی غلبے کے ساتھ تہذیبی و ثقافتی بالادستی بھی حاصل کی۔ اس عہد غلامی میں غریب متوسط طبقے کے لوگ سامراجی ہتھکنڈوں اور ظلم کا شکار رہے ہیں، "نیا قانون" کا منگو ہو یا "نعرہ" کا کیشولال ان سب کی مزاحمت انگریز سامراج کی بے حسی، جبر اور ناانصافی کے خلاف ہے۔ جن کی پالیسیاں برصغیر کے غریب عوام، نچلے طبقے کے حقوق کی قطعی طور پر ضامن نہ تھیں۔ جن کا مقصد صرف اور صرف پامالی اور جبر و استحصال تھا۔ اس نظام نے جاگیرداری نظام کو تقویت بہم پہنچائی، سرمایہ دار نے غریب بے بس دہقانوں کا خون چوسا۔ جاگیردار زمیندار نے جنسی جبر اور معاشی استحصال کیا۔ سرکاری بدعنوان افسروں کے کارندوں نے خوب لوٹ کھسوٹ کی۔

References

[1]Abul Fazal, Molana, Abdul Hafeez Balyativi, *Misbah Ul Lughat,* (Lahore: Maktaba Qadusia, July, 1999), 551

[2] Farman Fateh Puri, Dr., *Urdu Afsana Aur Afsana Nigar,* (Lahore: Al Waqar Publications, 2000),132

[3] Manto, Sadat Hassan, *Atish Paray,* (Dehli: Saqi Book Dipu, 1984), 20

[4]Anwar Ahmad, Dr., *Urdu Afsana Aik Sadi ka Qisssa,*(Multan: Publishers Kitab Nagar,2017), 340

[5]Manto, Sadat Hassan, *Manto Rama,* (Lahore: Sange Meel Publications, 2019), 708

[6]Manto, Sadat Hassan, *Manto Rama,* (Lahore: Sange Meel Publications, 2019), 800

[7] Anwar Ahmad, Dr., *Urdu Afsana Aik Sadi ka Qisssa,*(Multan: Publishers Kitab Nagar,2017), 341

[8] Manto, Sadat Hassan, *Manto Rama,* (Lahore: Sange Meel Publications, 2019), 838

[9] Manto, Sadat Hassan, *Manto Rama,* (Lahore: Sange Meel Publications, 2019), 117

[10]Anwar Ahmad, Dr., *Urdu Afsana Aik Sadi ka Qisssa,*(Multan: Publishers Kitab Nagar,2017), 350

[11] Manto, Sadat Hassan, *Namrood ki Khudai,* (Dehli: Saqi Book Dipu, 1990), 10

[12] Waqar Azeem, Syed, *Dastan se Afsany Tak,* (Dehli: Jamal Printing Press, June 1972), 392,393

[13] Manto Sadat Hassan, *Yazeed,* (Dehli: Jamal Press, Jadid Edition, 1986), 14

[14] Anwar Ahmad, Dr., *Urdu Afsana Aik Sadi ka Qisssa,*(Multan: Publishers Kitab Nagar,2017), 342

[15]Manto Sadat Hassan, *Phanday,* (Dehli: Saqi Book Dipu, Jadid Edition, 1991), 20

[16]Manto, Sadat Hassan, *Atish Paray,* (Dehli: Saqi Book Dipu, 1984), 48

[17] Waris Alvi, *Manto ka Fun, Hayat-O-Moot ki Awaizish,* Mashmoola Urdu Afsana Riwayat-O-Masail (Lahore), 217

[18] Manto Sadat Hassan, *Sadak Kay Kinary,* (Dehli: Saqi Book Dipu),170.